پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی

سیدنا الحکم القرشی الاُموی رضی اللہ عنہ

حضرت مروان رضی اللہ عنہ کے والد سیدنا الحکم القرشی الاموی رضی اللہ عنہ قبیلہ قریش کی شاخ بنواُمیّہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مجد وشرف اور عزت و وجاہت کے اعتبار سے بنو ہاشم کے بعد بنواُمیّہ ہی کا مرتبہ ومقام تھا۔ چنانچہ قومی علَم ''عقاب'' ان ہی کی تحویل میں رہتا تھا۔ علاوہ ازیں سپہ سالار اعظم کا منصب بھی اسی خاندان کے پاس تھا۔ ''حرب فجار'' (جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شرکت فرمائی تھی) میں سپہ سالار اعظم کے فرائض سیدنا الحکم رضی اللہ عنہ کے حقیقی چچا حرب بن اُمیّہ نے انجام دیے تھے۔

سیدنا الحکم رضی اللہ عنہ کا سلسلہ نسب (الحکم بن ابی العاص بن اُمیّہ بن عبدشمس بن عبدمناف) چوتھی پشت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف) کے نسب سے مل جاتا ہے۔

اسلام قبول کرنے سے پہلے سیدنا الحکم رضی اللہ عنہ بھی دیگر رؤساء قریش کی طرح اسلام کے سخت مخالف تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب اسلام قبول کیا تو وہ بھی اپنے اس چچا کے زیرعتاب رہے اور اللہ کی راہ میں اذیت پہنچائے گئے۔ الحکم بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایک مرتبہ رسی سے باندھ دیا اور کہا کہ:

''کیا تم نے اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر نئے دین کو اختیار کرلیا ہے؟ میں تم کو اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک تم اس دین سے پھر نہیں جاتے۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے چچا کو جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ:

''اللہ کی قسم! میں کبھی اس دین کو نہیں چھوڑ سکتا۔''

جب چچا نے بھتیجے کی دین پر استقامت اور اپنے مؤقف میں صلابت دیکھی تو انہیں چھوڑ دیا۔

(التمہید والبیان فی مقتل الشہید عثمان رضی اللہ عنہ، ص:۲۲)

غزوۂ احزاب میں قریش مکہ کی ناکامی اور ہزیمت سے ان کی قوتِ مزاحمت بھی کافی حد تک کمزور ہوگئی بلکہ اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان سے ان کی ہمت مزید ٹوٹ گئی کہ:

اَلآنَ نَغْزُوْهُمْ وَلَا يَغْزُوْنَنَا نَحْنُ نَسِيْرُ اِلَيْهِمْ.

(صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق وہی الاحزاب، رقم الحدیث:۴۱۱۰)

اب ہم ان سے لڑیں گے وہ (اقدام کرکے) ہم سے نہیں لڑسکیں گے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ غزوہ احزاب کے بعد مشرکینِ مکہ سے اقدام نہ ہوسکا بلکہ مسلمانوں نے ہی فتح مکہ میں اقدام کیا تھا۔

غزوۂ احزاب کے بعد ۶ھ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی

معیت میں عمرہ ادا کرنے کی غرض سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے لیکن مشرکین نے حدیبیہ کے مقام پر انھیں روک دیا۔ مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ساتھ کسی تصادم سے بچنے کی خاطر مصالحت کی گفتگو کا ارادہ فرمایا۔ اور اس مقصد کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ انتخاب حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر پڑی تو انھوں نے عرض کیا کہ:

''مکہ میں بنوعدی کا ایسا کوئی فرد موجود نہیں جو دیگر قریش کے مقابلے میں میری حمایت کر سکے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا جائے کہ مکہ میں ان کے قبیلہ کے لوگ موجود ہیں۔''

چنانچہ اس تجویز پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ:

''آپ قریش کے پاس جائیں اور انھیں بتائیں کہ ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے ہیں۔ دیکھ لیں ہم حالتِ احرام میں ہیں اور قربانی کے جانور بھی ہمارے ساتھ ہیں۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس حکمِ نبوی کی تعمیل کرتے ہوئے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو سیدنا الحکم رضی اللہ عنہ کے بھتیجے ابان بن سعید بن العاص نے انھیں پناہ دی۔ اس طرح انھوں نے سردارانِ قریش سے ملاقات کر کے ان تک پیغام نبوی پہنچا دیا۔ قریش کے ہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقام و مرتبے کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ قریشی خواتین اپنے بچوں سے یوں مخاطب ہوتی تھیں کہ

اُحبّک والرحمن حبّ قریش لعثمان

ترجمہ: رحمٰن کی قسم میں تجھ سے اس طرح محبت کرتی ہوں جس طرح قریش عثمان سے محبت کرتے ہیں۔

لہٰذا اسی جذبے کے تحت قریش نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہ پیشکش کی کہ وہ خود عمرہ کر لیں لیکن انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر عمرہ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے قیام مکہ کے دوران میں اپنے چچا اور دیگر افرادِ خاندان سے بھی ملاقاتیں کیں اور ان ہی کے ہاں قیام پذیر رہے۔ اس سفارت کا حضرت حکم رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرات پر بڑا اثر پڑا، جس سے ان کے دل نرم ہو گئے۔

دوسری طرف اس تاخیر کی وجہ سے حدیبیہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر عام ہو گئی۔ جو بالآخر ''بیعت رضوان'' پر منتج ہوئی۔ اس بیعت کے بعد فریقین میں ایک معاہدہ طے پا گیا جس کی رو سے اگلے سال یعنی ۷ھ میں عمرہ ادا کیا گیا جو تاریخ میں ''عمرۃ القضاء'' کے نام سے مشہور ہے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کامیاب سفارت کی وجہ سے حضرت حکم رضی اللہ عنہ اور دیگر افراد بنواُمیّہ کی قلبی کیفیت تبدیل ہو چکی تھی۔ فتح مکہ سے پہلے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسے جرنیل اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جیسے سفارت کار نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے اس وقت اسلام قبول نہ کرنے کے باوجود ہرقل کے دربار میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ عمدہ الفاظ کے ساتھ کیا۔

اسی اثناء میں قریش نے معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے حلیف قبیلے کی بنوخزاعہ پر حملہ کی

بھرپور حمایت کی تو جواباً بنوخزاعہ نے بھی معاہدے کی رو سے بنوبکر کے خلاف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد کی درخواست کردی جس کے نتیجے میں رمضان ۸ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوگیا اور حضرت حکم بن ابی العاص سمیت سینکڑوں قریش نے اسلام قبول کرلیا۔ان کے اسلام قبول کرنے کا ذکر طبقات ورجال کی تمام کتب میں پایا جاتا ہے۔

علاّمہ محمد بن سعد (م۲۳۰ھ) فرماتے ہیں کہ:

''حکم بن ابی العاص بن اُمیّہ بن عبدشمس،ان کی والدہ رقیّہ بنت الحارث بن عبید بن عمرابن مخزوم تھیں۔فتح مکہ پر اسلام لائے اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خلافت تک وہیں مقیم رہے۔عثمان رضی اللہ عنہ کے بلانے پر مدینے چلے گئے اور وہیں ۳۲ھ میں ان کے عہدِ خلافت میں ہی وفات پائی۔الحکم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے (حقیقی) چچا تھے۔''

(طبقات ابن سعد اردو۔حصہ پنجم،ص:۴۱۷۔مطبوعہ:نفیس اکیڈمی کراچی)

حافظ ابن عبدالبر اندلسی (م۴۶۳ھ) لکھتے ہیں کہ:

''**الحکم بن ابی العاص بن اُمیّة بن عبد شمس بن عبد مناف ابن قصیّ القرشی الاموی عمّ عثمان ابن عفان و ابو مروان بن الحکم کان من مسلمة الفتح.....**''

(الاستیعاب مع الاصابہ،جلد:اوّل،ص:۳۱۷)

الحکم بن ابی العاص.....فتح مکہ کے مسلمانوں میں سے ہیں۔

امام ابن اثیر جزری (م۶۳۰ھ) لکھتے ہیں کہ:

''ابومروان حکم بن ابی العاص.....قرشی اموی۔ان کا شمار اہل حجاز میں ہے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے چچا ہیں۔فتحِ مکہ کے دن اسلام لائے۔''

(اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ تحت الحکم بن ابی العاص)

علاّمہ ابن حجر عسقلانی (م۸۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ:

''**الحکم بن ابی العاص بن اُمیّة بن عبد شمس القرشی الاموی عمّ عثمان بن عفان و والد مروان.قال ابن سعد: اسلم یوم الفتح.....**''(الاصابہ فی تمییز الصحابہ مع الاستیعاب،الجزءالاوّل،ص:۳۴۵)

مروان رضی اللہ عنہ کے والد اور عثمان رضی اللہ عنہ کے چچا حکم بن ابی العاص نے ابن سعد کے مطابق فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا۔

ابن سعد کی روایت کے مطابق اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت حکم رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں ہی قیام پذیر رہے۔شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کے بقول حجۃ الوداع میں بھی انھیں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

(ملاحظہ ہو:منہاج السنۃ،الجزءالثالث،ص:۱۸۹)

اس تفصیل سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہوگئی ہے کہ حضرت مروان رضی اللہ عنہ کے والد اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حقیقی چچا حکم بن ابی العاص رضی اللہ عنہ بلاشک وشبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔

اصطلاحِ شریعت میں ''صحابی'' اس خوش نصیب شخص کو کہا جاتا ہے جس نے حالت اسلام وایمان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی ہو اور اسلام ہی پر اس کی موت بھی واقع ہوئی ہو۔

مندرجہ بالا حوالہ جات سے حضرت حکم رضی اللہ عنہ کا اسلام قبول کرنا ثابت ہے جب کہ اسلام ہی کی حالت میں ۳۲ھ میں ان کی وفات بھی ہوئی اور خلیفۂ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھا کر انھیں ''جنت البقیع'' میں دفن کر دیا۔

ظاہر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں سینکڑوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظامؒ نے بھی ان کی نماز جنازہ میں شرکت فرمائی تھی۔ اس کے بعد حضرت حکم رضی اللہ عنہ کے صحابی ہونے میں تو کسی مومن کو ذرہ برابر بھی شک نہیں ہوسکتا۔

مگر سخت افسوس ہے کہ اس اعتراف کے باوجود حضرت حکم رضی اللہ عنہ کو نہ صرف ''صحابیت'' کے مشروعہ ومطلوبہ ادب واحترام سے محروم رکھا گیا بلکہ اعدائے صحابہ کے مذموم اور زہریلے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر بعض ''علماءِ اسلام'' نے بھی ان کے خلاف موضوع روایات کو صحیح سمجھ کر نقل کر دیا جن سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی توہین ظاہر ہوتی ہے۔

چنانچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی فرماتے ہیں کہ:

''اس معاملہ میں مثال کے طور پر مروان بن حکم کی پوزیشن دیکھئے۔ اس کا باپ حکم بن ابی العاص، جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا چچا تھا، فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوا تھا اور مدینہ آ کر رہ گیا تھا مگر اسی کی بعض حرکات کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مدینہ سے نکال دیا تھا اور طائف میں رہنے کا حکم دیا تھا۔

ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں اس کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اکابر صحابہ کے ساتھ راز میں جو مشورے فرماتے تھے ان کا کسی نہ کسی طرح سن گن لے کر وہ انھیں افشا کر دیتا تھا۔

اور دوسری وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نقلیں اُتارا کرتا تھا حتی کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اسے یہ حرکت کرتے دیکھ لیا۔ بہرحال کوئی سخت قصور ہی ایسا ہوسکتا تھا جس کی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے اس کے اخراج کا حکم صادر فرمایا۔'' (خلافت وملوکیت، ص:۱۱۰)

مودودی صاحب حضرت مروان رضی اللہ عنہ کو حضرت حکم رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہونے کی وجہ سے ''طلقاء'' کا طعنہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اوّل یہ کہ اس خاندان کے جو لوگ دورِ عثمانی میں آگے بڑھائے گئے وہ سب ''طلقاء'' میں سے تھے۔ ''طلقاء'' سے مراد مکہ کے وہ خاندان ہیں جو آخر وقت تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دعوتِ اسلامی کے مخالف رہے۔ فتح مکہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معافی دی اور وہ اسلام میں داخل ہوئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، ولید بن عقبہ اور مروان بن الحکم ان ہی معافی یافتہ خاندانوں کے افراد تھے۔'' (خلافت وملوکیت، ص:۱۰۹)

انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں ایک حوالہ علمائے حق کے ترجمان کا بھی نذرِ قارئین کر دیا جائے۔ چنانچہ علاّمہ محمد انور شاہ کاشمیریؒ کے داماد اور مؤلف ''انوار الباری شرح صحیح البخاری'' مولانا سید احمد رضا بجنوری فرماتے ہیں کہ:

''مروان کا باپ حکم بھی بہت بدکردار تھا۔ وہ حضور علیہ السلام کی ازواج مطہرات کے حجروں پر جاسوسی کیا کرتا تھا، ان میں وہ جھانکتا تھا اور راز کی خبریں لوگوں کو پہنچایا کرتا تھا، حضور علیہ السلام کی نقلیں اُتارا کرتا تھا وغیرہ۔ اسی لیے حضور علیہ اسلام نے اس کو اور اس کے بیٹے مروان کو مدینہ منوّرہ سے جلاوطن کر کے طائف بھیج دیا تھا۔ پھر وہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے زمانوں میں بھی نہ آسکا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں باپ بیٹے دونوں مدینہ طیبہ آ گئے تھے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری کتاب الفتن میں حدیث ''**هلاک امتی علا یدی اغیلمة السفهاء**'' کے تحت لکھا ہے کہ بہت سی احادیث حکم اور اس کی اولاد کے ملعون ہونے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں جن کی تخریج طبرانی وغیرہ نے کی ہے۔ ان میں زیادہ تو محل نظر ہیں مگر بعض جیّد بھی ہیں۔'' (انوار الباری، جلد: ۱۷، ص: ۱۹۴، مطبوعہ: ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان)

پیچھے کتب طبقات ورجال کے حوالے سے یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ حضرت حکم رضی اللہ عنہ بلاشبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں تو پھر قرآن وحدیث میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جو خصوصیات اور مناقب وفضائل ثابت ہوئے ہیں وہ سب کے سب لامحالہ حضرت حکم رضی اللہ عنہ کے لیے بھی ثابت ہوں گے۔

اور وہ تمام آثار ولوازمِ صحابیت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وہ تمام حقوق جو کتاب وسنت نے اُمّت پر عائد کیے ہیں وہ سب کے سب حضرت مروان رضی اللہ عنہ اور ان کے والد گرامی حضرت حکم رضی اللہ عنہ کے لیے بھی ماننے پڑیں گے۔ ہمیں تاریخی طور پر نہیں بلکہ بطور عقیدہ کے اس پر ایمان لانا پڑے گا کہ حضرت حکم رضی اللہ عنہ بوجہ صحابی ہونے کے متقن، عدول، پاک باطن، صاف ظاہر، محبت جاہ ومال سے بری، ہوسِ اقتدار سے بالاتر اور ان تمام رذائل نفس سے پاک تھے جو ان مقدّسین سے بنصّ کتاب وسنت دھو دیے گئے تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توہین وتنقیص اور ان کا انتہائی تحقیر آمیز انداز کے ساتھ ذکر کرنے والوں کا کتاب وسنت میں جو حکم ہے وہ بھی بلاشبہ حضرت حکم رضی اللہ عنہ کے مخالفین پر عائد ہونا لازم آئے گا۔

حضرت حکم رضی اللہ عنہ کی جلاوطنی کے ''قصے'' کی حقیقت ایک مستقل مضمون میں طشت از بام کی جائے گی۔ ان شاء اللہ

جناب مودودی صاحب نے ''طلقاء'' کی جو تعریف بیان کی ہے وہ تعصب وعناد پر مبنی ہے کیونکہ اسلام کسی خاندان کا نام نہیں ہے جس سے دوسرے خاندانوں کے افراد جنگ کر رہے ہیں۔ جس طرح اسلام میں اس وقت تمام خاندان شامل تھے اسی طرح کفر میں بھی سب خاندانوں کی نمائندگی پائی جاتی تھی۔ اسلام اور کفر کے مابین تصادم باپ وبیٹا، داماد وخسر، چچا وبھتیجا، ماموں وبھانجا حتیٰ کہ بھائی بھائی ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آراء تھے۔ شرکائے بدر پر ہی ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیں تو رشتوں کے مناظر سامنے آجائیں گے۔ تاریخ اسلام میں اس طرح کی بیسیوں مثالیں پائی جاتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اور کفر کے تصادم کو ''قبائلی اور خاندانی'' تصادم قرار دینا خلافِ واقع اور نری جہالت ہے۔

فتح مکہ کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عام معافی کا اعلان خاندانوں اور قبیلوں کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ یہ اعلان مکہ کے تمام باشندگان کے لیے تھا۔ ان میں سے اکثر خاندان اور قبائل ایسے تھے جن کے بعض افراد اگرچہ اسلام قبول کر چکے تھے لیکن ان میں سے باقی ماندہ افراد فتح مکہ کے دن یا اس کے کچھ عرصہ بعد مسلمان ہوئے تھے۔

بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ جو سابقین اوّلین میں سے تھے ان کے خاندانوں کے بہت سے افراد ایسے ہیں جنھوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا۔ حتیٰ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے سابق الایمان کے والد بھی فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تو کیا جناب مودودی صاحب وامثالہ کے استدلال کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی معافی یافتہ خاندان کے فرد تھے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی جناب عقیل رضی اللہ عنہ اور ان کی بہن سیدہ اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا نے بھی فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا تو کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی معافی یافتہ خاندان کے فرد تھے؟

اس طعن کو اگر وسعت دیتے جائیں تو اس کی زد سے سابقین اوّلین سمیت کون سا خاندان اور کون سا قبیلہ محفوظ رہ سکتا ہے؟

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ حقیقتِ حال واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''یہ چیز جمہور قریش میں مشترک ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے رشتہ دار ایسے رہے ہیں جو کافر تھے۔ کفر کی حالت میں انھوں نے مسلمانوں سے جنگیں لڑیں اور اسی راہ میں وہ مارے گئے اور بہت سے حالتِ کفر میں ہی طبعی موت مر گئے۔ کیا یہ بات ان مسلمانوں کے لیے باعثِ رسوائی سمجھی جائے گی جو ان کے خاندانوں میں سے مسلمان ہو گئے تھے؟

عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابی جہل اور صفوان رضی اللہ عنہ بن اُمیّہ دونوں خیارِ مسلمین سے تھے درآں حالیکہ ان دونوں کے باپ حالتِ کفر میں جنگ بدر میں مارے گئے۔

اسی طرح حارث بن ہشام ہیں جن کے بھائی جنگ بدر میں قتل کر دیے گئے۔ مختصر یہ کہ اس طرح اگر طعن کی اجازت دے دی جائے تو پھر اس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ تمام اہلِ ایمان پر طعن کیا جا سکتا ہے۔

کیا کسی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس بناء پر موردِ طعن بنائے کہ ان کے چچا ابولہب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین دشمن تھے یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اس بناء پر عیب گیری کرے کہ ان کے بھائی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تھے۔ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے باپ ابوطالب کے کفر کی وجہ سے ننگ و عار دلائے۔ یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق اس طرح کہا جائے۔ یاد رکھو! اس طرح کی باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جو مسلمان نہیں ہیں۔'' (منہاج السنۃ، جلد اوّل، الجزء الثانی، ص: ۲۱۶۔ طبع: بیروت)

حضرت مروان رضی اللہ عنہ پر ''طلقاء'' کا اطلاق اس لیے درست نہیں ہے کہ وہ خود مودودی صاحب کی تحقیق کے مطابق اس وقت ۷/۸ سال کے بچے تھے جب کہ اس عمر کا بچہ شریعت میں مکلّف نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ حضرت حکم رضی اللہ عنہ پر اس کا اطلاق ''درست'' ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ لفظ باعثِ تحقیر اور باعثِ مذمت ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب اثبات میں تو ہرگز نہیں ہو سکتا تو پھر معلوم نہیں کہ مودودی صاحب وامثالہ نے اسے قابل طعن کیوں سمجھا؟

سخت حیرت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاف کر دینے کے باوجود سبائیوں اور ان کے نام نہاد سُنّی متبعین نے آج تک بالخصوص اُموی صحابہ رضی اللہ عنہم کو معاف نہیں کیا۔

''طلقاء'' کی اصطلاح حسب ذیل واقعہ سے ماخوذ ہے:

فتح مکہ کے بعد جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم طواف سے فارغ ہوئے تو قریش کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''اے گروہِ قریش! تمھیں کیا توقع ہے کہ اس وقت میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ انھوں نے جواب دیا: ہم اچھی اُمید رکھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کریم النفس اور شریف بھائی ہیں اور کریم وشریف بھائی کے بیٹے ہیں۔ یہ جواب سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَقُوْلُ لَكُمْ كَمَا قَالَ يُوْسُفُ لِإِخْوَتِهٖ: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاء.

ترجمہ: میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا: ''آج تم پر کوئی الزام نہیں۔'' جاؤ تم سب آزاد ہو۔

یہ واقعہ رمضان المبارک ۸ھ کا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر حضرت حکم رضی اللہ عنہ کے خاندان ''بنواُمیّہ'' کو نہیں بلکہ پورے قریش (بنوتیم، بنوعدی، بنومخزوم، بنوخزیمہ، بنواسد، بنونوفل، بنوزہرہ، بنواُمیّہ اور بنوہاشم) کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ تم سب کو معافی دے دی گئی، جاؤ اب تم سب آزاد ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خطاب میں بار بار ''یامعشر قریش'' فرمایا۔ یہ خطاب خود بتلا رہا ہے کہ ''طلقاء'' صرف بنواُمیّہ نہ تھے بلکہ ''مولودِ کعبہ'' حکیم بن حزام، ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب ہاشمی، عکرمہ بن ابی جہل، عقیل بن ابی طالب ہاشمی، اُمّ ہانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہم اور تقریباً دو ہزار افراد (جنھوں نے اسی موقع پر اسلام قبول کیا تھا) یہ سب ''طلقاء'' میں شامل ہیں۔ لیکن یہ لفظ ان حضرات کے لیے ''موجبِ طعن'' اور ''باعثِ تحقیر'' ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ وہ قبولِ اسلام کے بعد شرفِ صحابیت سے مشرف ہو گئے ہیں اور یہ وہ ''منصب'' ہے جس تک کروڑوں عابد وزاہد مل کر بھی نہیں پہنچ سکتے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ ''طلقاء'' (بشرطِ صحتِ روایت) کے استعمال سے مطلب یہ تھا کہ ہم تمھاری سابقہ مخالفانہ سرگرمیوں کو نظر انداز کر کے تمھارے لیے عام معافی کا حکم دیتے ہیں۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ قوت حاصل ہونے کے بعد ہم تمھاری عداوتوں کا انتقام لیں گے۔ تم پر کوئی گرفت نہیں تم مکمل طور پر آزاد ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ قریش کے لیے ''طلقاء'' یعنی عام معافی کا لفظ دراصل ان کی عظمت، منقبت اور فضیلت کا باعث ہے۔ یہ لفظ کسی طور پر بھی مذمت یا تحقیر کے لیے استعمال نہیں ہوتا مگر جن لوگوں کے دلوں میں ''کھوٹ'' ہے وہ اس لفظ کو بطور تحقیر اور مذمت استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی ''طلقاء'' کو بڑے بڑے اور اہم مناصب عطا فرمائے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توقعات پر پورے بھی اترے۔ رضی اللہ عنہم ورضوعنہ

آخر میں اس بحث کے ایک انتہائی اہم پہلو کی طرف اہلِ علم کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ:

جناب مودودی صاحب نے اربابِ سیر اور مؤرخین کے نقل کردہ جس جملے ''اذہبوا فانتم الطلقاء'' کی بنیاد پر طعن وتشنیع اور توہین وتنقیص کی اتنی بلند وبالا عمارت کی تعمیر کی ہے، اصولِ روایت ودرایت کے اعتبار سے خود اس کی اپنی حیثیت کیا ہے؟

محدثین کرام بالخصوص مؤلفین وجامعینِ صحاحِ ستہ نے فتح مکہ کے حوالے سے سارے سفر کی جزئیات تک بیان کی ہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اہم خطاب کا مرکزی ''جملہ'' فراموش کر گئے؟

معلوم نہیں کہ کتب حدیث میں یہ جملہ کیوں نہیں پایا جاتا؟ اور صرف ارباب سِیَر اور مؤرخین ہی کے ذریعے کیوں نقل ہوتا چلا آ رہا ہے؟ اگر یہ جملہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہوتا تو محدثین کرام بالخصوص امام بخاری اور امام مسلم اس خطبہ کے تحت اس جملہ کا ضرور کوئی ذکر کرتے۔

دراصل اس جملہ کو سب سے پہلے ابن ہشام نے براویت محمد بن اسحاق نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے قریش کے لوگو! تمھارا کیا خیال ہے میں تمھارے ساتھ کیا برتاؤ کروں گا؟ انھوں نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کرم فرما بھائی اور کرم فرما بھائی کے بیٹے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: آج تم سے کوئی باز برس نہیں ہوگی۔ ''جاؤ تم سب آزاد ہو۔''

اس روایت سے یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ اس جملہ کے راوی یا بانی محمد بن اسحاق (م ۱۵۱ھ) ہیں جو امام ''فن مغازی'' کے نام سے شہرت یافتہ ہیں۔ انھیں امام زہری کا خاص قرب حاصل تھا۔ یوں تو زہری کے دروازہ پر ایک دربان مقرر تھا کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کے اندر نہ آئے لیکن ابن اسحاق کو عام اجازت حاصل تھی کہ جب چاہیں چلے آئیں۔ ان کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کی نسبت متاخرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے کہ محدثین کو ابن اسحاق کی کتاب پر ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ وہ یہودیوں سے واقعات سن کر اپنی کتاب میں درج کرتے تھے۔

علاّمہ ذہبی کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن اسحاق یہود و نصاریٰ سے راویت کرتے تھے اور ان کو ثقہ سمجھتے تھے۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ:

محمد بن اسحاق سِیَر و مغازی کے مستند ترین مؤرخ ہیں لیکن یہی محمد بن اسحاق جب حدیث میں پہنچتے ہیں تو حضرات محدثین انہیں خصوصیت سے احکام کی روایت میں نا قابلِ اعتبار قرار دیتے ہیں۔

(ہمارے عائلی مسائل، ص: ۱۷۹۔ طبع جدید دارالاشاعت کراچی)

احکام کی روایات میں ابن اسحاق کو نا قابلِ اعتبار قرار دینے کے علاوہ محدثین نے ان پر سخت ترین الفاظ میں جرح بھی کی ہے۔

امام نسائی کہتے ہیں یہ قوی نہیں، دارقطنی کہتے ہیں ان کی حدیث حجت نہیں۔ ابن نمیر کا بیان ہے کہ ان پر قدری ہونے کا الزام ہے۔ اسی لیے لوگ ان سے دور بھاگتے تھے۔ امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ یہ قدری بھی ہے اور معتزلی بھی۔ امام مالک نے بھی ابن اسحاق کو کذاب قرار دیا ہے۔ ابن ادریس کا بیان ہے کہ میں ایک روز امام مالک کی خدمت میں حاضر تھا، کسی نے ان سے کہا کہ ابن اسحاق کہتا ہے کہ امام مالک کا علم میرے سامنے پیش کیا کرو، میں ان کے علم کی کسوٹی ہوں۔ تو امام مالک نے فرمایا: اے لوگو! دجالوں میں سے اس دجال کو دیکھو کہ کیا کہتا ہے؟ خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ محمد بن اسحاق مجہول راویوں سے غلط روایتیں نقل کرتا تھا۔ ملاحظہ ہو: (میزان الاعتدال، تاریخ بغدادی تحت محمد بن اسحاق)

محمد بن اسحاق نے اُمّ المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف نبی اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم کے معراج جسمانی کے انکار کی روایت بھی منسوب کی ہے۔ مغازی ابن اسحاق کو ابن ہشام (م۲۱۳ھ) نے نئی ترتیب دی ہے جو سیرت ابن ہشام کے نام سے معروف ہے۔ ابتداء میں جب یہ کتاب سامنے آئی تو اس کے بعض واقعات پر اہل علم نے اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی اور ان اعتراضات کی وجہ سے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کتاب اپنے زمانہ میں مقبولیت حاصل نہ کر سکی جسے بعد میں ابن ہشام نے بعض قابلِ اعتراض واقعات خارج کر کے اور بعض واقعات کا اضافہ کر کے نئے سرے سے مرتب کیا لیکن اس کوشش کے باوجود بعض قابلِ اعتراض واقعات کتاب میں شامل کر دیے گئے۔

''طلقاء'' کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ میں ''اذہبوا فانتم الطلقاء'' کا جملہ بھی سیرت ابن ہشام میں براویت محمد بن اسحاق ہی بیان ہوا ہے جہاں سے دیگر مؤرخین اور اربابِ سِیَر اسے آگے اپنی کتابوں میں نقل کرتے رہے۔

پیچھے یہ وضاحت گزر چکی ہے کہ ''طلقاء'' کے لفظ میں بظاہر کسی کی توہین یا تنقیص نہیں پائی جاتی لیکن اس کے باوجود مودودی صاحب وامثالہ نے اُموی صحابہ رضی اللہ عنہم کے حق میں اس لفظ کو موجبِ طعن وقدح بنا لیا ہے اس لیے یہاں اس کی اصل حقیقت واضح کر دی گئی ہے کہ اس ''جملے'' کی نسبت قطعیت کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنا ہی محل نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ''جملہ'' کتبِ حدیث میں مفقود ہے۔ اس کے برعکس ایک حدیث میں حسب ذیل الفاظ آئے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کی چوکھٹ کو پکڑ کر فرمایا:

یا معشر قریش ما تقولون ؟ قالو: نقول ابن أخ و ابن عمّ رحیم کریم ثم عاد علیھم القول ، قالوا: مثل ذالک قال: فانّی اقول کما قال أخی یوسف: لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللّٰہ لکم و ھو ارحم الراحمین. (سورہ یوسف: آیت۹۲)

ترجمہ: اے قریشیو! تمھارا (میرے بارے میں آج) کیا خیال ہے؟ انھوں نے کہا: ہم تو یہی کہتے ہیں کہ آپ ہمارے بھتیجے اور چچازاد ہیں اور آپ بڑے مہربان اور کریم ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پھر وہی سوال کیا اور انھوں نے بھی وہی جواب دیا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے کہی تھی کہ: آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تعالیٰ تمھیں بخشے اور وہ رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

(السنن الکبری للنسائی، جلد: ۷، ص: ۳۸۳۔ ح: ۱۱۲۹۸۔ واسنادہ حسن لذاتہ۔ بحوالہ سیرت کے سچے موتی، ص: ۴۶۸، مؤلفہ: امیر حمزہ صاحب)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام کا حوالہ دے کر سورۃ یوسف کی آیت ۹۲ ہی تلاوت فرمائی تھی جس کی مزید تشریح محمد بن اسحاق نے ''اذہبوا فانتم الطلقاء'' کے جملہ سے کر دی۔

جب کہ حدیث میں منقول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسم کا خطبہ بڑا ہی واضح تھا اور وہ طلقاء جیسے لفظ کے ذریعے کسی مزید تشریح کا محتاج ہرگز نہیں تھا۔ اس خطبہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ''انداز'' نہایت ہی قابلِ غور ہے کہ اپنے سامنے موجود قریش کے تمام خاندانوں کو مخاطب کر کے ایک سوال کرتے ہیں۔ جواب ملنے کے بعد پھر اسی سوال کو دہراتے ہیں اور

قریش بھی اپنے پہلے جواب ہی کا اعادہ کرتے ہیں۔قریش نے اپنے اس جواب میں حقیقت کا اعتراف اور اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے آپ کو کلّی طور پر فاتح مکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا۔

دراصل قریش کا یہ جواب بھی برادرانِ یوسف کے جواب کے ساتھ مشابہت رکھتا تھا کہ ''**قالوا تاالله لقد اثرک الله علینا و ان کنا لخاطئین**'' (یوسف:۹۱)

انھوں نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر برتری دی ہے اور یہ بھی بالکل سچ ہے کہ ہم خطا کار تھے۔

فتح مکہ کے موقع پر بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر طرح کی برتری حاصل ہے اور اپنے بھائیوں کے مظالم بھی یاد ہیں لیکن جس طرح حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں کے مظالم کو ان کی جہالت اور نادانی (**اذ انتم جٰھلون**. یوسف: ۸۹) پر محمول کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں فرمایا تھا: **لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللّٰہ لکم و ھو ارحم الراحمین**. '' آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔اللہ تمھیں بخشے اور وہ سب مہربانوں سے بڑا مہربان ہے۔

بعینہٖ اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ''**ابن اخ و ابن عمّ رحیم کریم**'' کے جواب میں اپنے اخلاق کریمانہ کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں فرمایا: **فانّی اقول کما قال أخی یوسف: لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللّٰہ لکم و ھو ارحم الراحمین.**

میں بھی وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی کہ آج تم پر کوئی ملامت نہیں اللہ تعالیٰ تمھیں بخشے اور وہ رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔

اس جامع، بے غبار اور غیر مبہم اعلان کے بعد مزید کسی تشریح (**اذھبوا فانتم الطلقاء**) کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔کیونکہ ''**لا تثریب علیکم الیوم**'' میں صرف معافی ہی کا اعلان نہیں کیا گیا بلکہ کسی قسم کی ''طعنہ زنی'' سے بھی اجتناب برتا گیا۔اس واقعہ کے بعد جب حضرت یوسف علیہ السلام کی اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام سے ملاقات ہوتی ہے تو ان کے سامنے اپنے رب کے احسانات کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ:

وَ قَدْ اَحْسَنَ بِیْ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَاءَ بِکُمْ مِّنَ الْبَدْوِ. (یوسف:۱۰۰)

اس نے میرے ساتھ بڑا احسان کیا جب کہ مجھے جیل خانے سے نکالا اور آپ لوگوں کو صحرا سے لے آیا۔

حالانکہ حضرت یوسف علیہ السلام کی کہانی جیل کی رہائی سے نہیں بلکہ کنوئیں میں ڈالنے سے شروع ہوتی تھی لیکن اس کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ اس سے بھائیوں کو طعنہ ملتا اور انھیں شرمندگی اٹھانا پڑتی جب کہ وہ اس سے پہلے بصورت وعدہ یہ اعلان فرما چکے تھے کہ ''**لا تثریب علیکم الیوم**''

اگر والد کے سامنے اپنی کہانی کا آغاز کنوئیں میں ڈالنے سے کرتے تو اس صورت میں بھائیوں کو نہ صرف طعنہ ملتا (کہ یہ ہیں کنوئیں میں ڈالنے والے) بلکہ وعدہ کی خلاف ورزی بھی ہوتی (جب ایک دفعہ معاف کر چکے تو پھر اسے زبان پر بھی نہ لائے)۔ یہ تو پھر بھائی تھے، حضرت یوسف علیہ السلام نے تو والد کو یہ بھی نہیں بتلایا کہ مجھے قید میں کس نے ڈالا تھا؟ بس اتنا کہا: **وَ قَدْ اَحْسَنَ بِیْ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ**

غور فرمائیں! یہاں نہ کنوئیں میں ڈالنے کا ذکر ہے اور نہ ہی قید خانے میں ڈالنے کا۔ کنوئیں میں ڈالنے کا ذکر ہوتا تو بھائیوں کو طعنہ ملتا اور انھیں شرمندہ بھی ہونا پڑتا۔ اور اگر قید میں ڈالنے کا ذکر کرتے تو پھر عزیز مصر اور اس کی بیوی پر ملامت ہوتی۔ پیغمبر علیہ السلام کے اخلاق کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ عزیز مصر اور اس کی بیوی پر بھی طعن وملامت ہو کیونکہ ان کے گھر میں بھی کچھ عرصہ قیام رہا اور کھاتے پیتے بھی رہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر قریش کے لیے اگر ''**لا تثریب علیکم الیوم**'' کا اعلان نہ بھی فرماتے اور صرف **فانّی اَقُوْلُ کَمَا قَالَ أَخِیْ یُوْسفُ** پر ہی اکتفا کر لیتے تو پھر بھی اس سے وہی مفہوم مراد لیا جاتا جو اگلے جملے میں بیان کیا گیا ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ساتھ ''**لا تثریب علیکم الیوم**'' فرما کر خود ہی تشریح فرما دی کہ جاؤ قریشیو! آج کے بعد تم پر کوئی طعنہ بھی نہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ اعلان ۲۱ رمضان المبارک ۸ھ میں فرمایا تھا لیکن صد افسوس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا کچھ ''علماء اہلِ سنّت'' چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی بنواُمیّہ سے تعلق رکھنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالخصوص حضرت حَکَم، حضرت ابوسفیان، حضرت معاویہ اور حضرت مروان رضی اللہ عنہم کو مسلسل تحریراً وتقریراً طعن وتشنیع کا نشانہ بنا رہے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

''**اِنَّ ممَّا اَدْرَکَ النَّاسُ مِنْ کَلَامِ النبوّۃِ الاوْلٰی: اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ**''

(صحیح بخاری، کتاب الادب، باب: **اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ**، رقم الحدیث: ۶۱۲۰)

اگلی نبوت کی باتوں میں سے لوگوں نے جو کچھ پایا ہے ان میں سے ایک مقولہ یہ بھی ہے کہ جب تم میں شرم وحیا نہ ہو تو پھر جو چاہو کرو۔

☆.....☆.....☆